فکرِ اسلامی کا عظیم سرمایہ

ایک مطالعاتی جائزہ

تحریر: محمد موسیٰ بھٹو

انیسویں صدی میں مغرب میں انسان اور کائنات کے مادی نقطۂ نگاہ کی تشریح اور ریاست اور ریاست کے جملہ علوم کو خالص سیکولر بنیادوں پر متشکل کر دینے کے فیصلہ سے نہ صرف یہ کہ مغرب میں مذہب اور خدا پرستی کی جگہ عقلیت' آزادی اور مادیت پرستی کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا' بلکہ اس کے اثرات اسلامی دنیا میں بھی تیزی سے پہنچنا شروع ہو گئے۔ چونکہ جدید علوم کو دین و مذہب سے آزاد اور خدا کے تصور سے بغاوت پر متشکل کیا گیا تھا' مغرب کے طاقتور استحصالی ملکوں کی طرف سے اسلامی ملکوں کو مفتوح کر کے ان کے نظامِ تعلیم کو تبدیل کر کے اپنے نظامِ تعلیم کے اجراء سے خود مسلمان ممالک کی ذہین آبادی میں دین و مذہب کی جدائی اور سیکولرزم کے تصورات فروغ پانے لگے اور وہ مسلمان معاشرہ جو انفرادی زندگی میں مذہب کی معمولی خلاف ورزی اور عمل کی عام کوتاہی کو بری نظروں سے دیکھتا تھا' اب اس معاشرہ میں شہروں اور محلوں کی سطح پر خوشحال آبادی میں ایسے افراد نمودار ہونے لگے جو اخلاقی اور عملی خرابیوں کے ساتھ ساتھ اعتقادی بگاڑ کا بھی شکار ہونے لگے اور جدید نظریات اور جدید علوم کے زیر اثر وہ اسلام کے بنیادی عقائد پر متشکک ہونے لگے اور انسان کے ارتقائی نظریۂ جدلیاتی مادیت کے تصور' کائنات کے بے خدا ہونے کے عقیدہ ''انسان سراپا جنسیت سے عبارت ہے یا وہ جبلتی جذبات کا کامل نمونہ ہے'' کے تصورات کے حامل افراد ابھرنے لگے۔ سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم پر اُبھارنے کے لئے جو تعلیمی

ادارہ تشکیل دیا' اس وقت انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں قرآن ہوگا' بائیں ہاتھ میں سائنس ہوگی اور ہماری پیشانی پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہوگا' لیکن سرسید کا قائم کردہ ادارہ ہی ملک میں سیکولر لیڈر شپ کی تیاری کا مرکز بن گیا۔

یہ ایسی صورت حال تھی جس نے مسلمان مفکرین کو اسلام کی ایسی نظریاتی اور علمی تشریح کرنے پر اُکسایا جس میں جدیدیت کی پیدا کردہ علمی گمراہی' اعتقادی بگاڑ اور جدید نظریات کے مقابلہ میں اسلام کی برتری ثابت ہو۔ انسان و کائنات کی تخلیق میں قدرت کی گہری منصوبہ بندی اور ''اسلام دین فطرت ہے' جس سے افراد کا اعراض خود انسانی معاشرہ کے لئے زوال کا موجب ہے'' اس فکری پس منظر میں اسلام کی جدید تشریح کے لئے بیسویں صدی میں جن مفکرین نے اعلیٰ پیمانہ پر کام کیا' ان میں علامہ اقبال' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا مودودی' ڈاکٹر محمد رفیع الدین' خلیفہ عبدالحکیم' سید قطب اور مظہر الدین صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مفکرین نے اپنی اعلیٰ ذہنی اور تخلیقی صلاحیتیں اسلام کی نئی عقلی' علمی اور سائنٹیفک تشریح میں صرف کیں۔ بعض مفکرین اس سلسلہ میں جدیدیت سے مرعوب اور متاثر ہوئے اور شریعت پر زور دینے کی بجائے وہ دین کے بنیادی اصولوں ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے اور اجتہاد کے ذریعہ اسلامی شریعت کے بنیادی قوانین میں تبدیلی کا نسخہ پیش کرتے رہے۔ بعض مفکروں نے اسلام کی بطور نظام زندگی والی تشریح پر اپنی بیشتر توانائیاں صرف کیں' جس کی وجہ سے اسلام کی خدا سے محبت کی نصب العینی تعلیم متاثر ہوئی اور افراد کی سیرت سازی اور کردار سازی کا عمل متاثر ہوا۔

ان مفکروں میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب پر اللہ کا یہ بڑا فیضان ہے کہ انہوں نے اسلامی فکر کی تشکیل جدید میں ایسا انداز اختیار کیا ہے جہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر جدیدیت سے مرعوبیت موجود نہیں اور اس فکر میں جہاں دورِ جدید کے بنیادی نظریات کا قرآن کی روشنی میں اعلیٰ دلائل' بہتر اسلوب اور سائنٹیفک انداز سے رد موجود ہے وہاں اسلامی فکر کی نصب العینی تشریح اور اس کے فرائض و واجبات کے

تدریجی نظام اور نصب العینی کے بنیادی مقتضاؤں کی تفصیل میں ڈاکٹر صاحب نے جس حکمت' بصیرت' توازن اور مؤمنانہ فراست سے کام لیا ہے وہ بے مثال ہے اور وہ ڈاکٹر صاحب کو دورِ جدید کے دیگر اسلامی مفکروں سے ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

خودشعوری کے عمیق مشاہدہ سے نتائج اخذ کرنا

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے قرآن وسنت کے وسیع مطالعہ' علمائے سلف سے گہرے ذہنی تعلق اور عارف فلسفی کی حیثیت سے نفس انسانی اور وجدان کی گہرائیوں اور خود شعوری (انسانی شخصیت) کی خصوصیات کے عمیق مشاہدہ سے جو نتائج اخذ کئے ہیں' اس کے مطابق انسان کی خودشعوری (شخصیت)' کائنات کی خودشعوری (اللہ کی ذات) سے تعلق کے ایسے رشتہ میں منسلک ہے کہ وہ اس تعلق کے منقطع ہونے کی محتمل ہی نہیں ہو سکتی۔ کائناتی خودشعوری سے بے نیازی' بے رخی اور انقطاع وہ چاہے چند لمحوں کا ہی کیوں نہ ہو' انسانی شخصیت کے لئے ناقابل برداشت اذیت کا موجب ہے اور اس سے فردِ انسانی غیر معمولی اعصابی اور ذہنی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر یہ انقطاع زیادہ دیر تک جاری رہے تو اس سے افراد طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں تک کو خطرہ میں ڈال لیتے ہیں۔ یہ خودشعوری (نفس انسانی) اور خودی (وجدان) کی خصوصیات کا وہ گہرا مطالعہ ومشاہدہ ہے جس سے ڈاکٹر صاحب عارف فلسفی کی حیثیت سے خود دوچار ہوئے ہیں۔ خودشعوری اور خودی کے اس مشاہدہ میں ڈاکٹر صاحب یک وتنہا نہیں ہیں' بلکہ اُمت کے ان لاکھوں عارفوں' علمائے ربانی اور صوفیاء کرام اور اولیاء کرام کا بھی یہی تجربہ ومشاہدہ ہے جو چودہ سو سال سے ملت کی تاریخ کے درخشاں ستاروں کی حیثیت سے موجود رہے ہیں۔ قرآن وسنت کے مطالعہ' علمائے ربانی سے تعلق اور خودشعوری کے اس مشاہدہ کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کی اسلام کی نصب العینی تشریح کا مرکزی نکتہ اللہ سے محبت کا نکتہ ہے' جس کے گرد ڈاکٹر صاحب کی ساری فکر گھومتی ہے۔

پاکیزہ نصب العین کی اہمیت اور اس کی تعیین کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا کردار

نصب العین کے موضوع پر اگر گفتگو کی جائے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ موجودہ دور میں انسانیت اور بالخصوص مسلم اُمت کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوا ہے کہ وہ صحیح اور فطری نصب العین کے تعین اور اس نصب العین کو اپنی زندگی کے سارے انفرادی واجتماعی اداروں کی روح میں شامل کرنے میں ناکام ہوئی ہے۔ انسانیت اور مسلم اُمت اس وقت جس ہولناک بحران سے دوچار ہے کہ اس کی کوئی کل درست نہیں' انسان انسان کے لئے اور قومیں قوموں کے لئے عذاب بن گئی ہیں' سائنسی ترقی اور سارے مادی وسائل انسان کو غلامی کی نئی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے استعمال ہو رہے ہیں' اس کا بنیادی سبب انسان کے فطری نصب العین کے تعین میں ناکامی ہے۔ انسان کی فطرت میں حسن وکمال کے حامل نصب العین کی محبت کا جذبہ اس قوت کے ساتھ رکھا گیا ہے کہ اس کے بغیر نہ تو انسانی زندگی کی تشکیل وتعمیر کا کام ممکن ہے اور نہ ہی انسان کے داخلی جذبات اور اس کی نفسیات کی طمانیت وتشفی ممکن ہے۔ فطرت سے ہم آہنگ نصب العین کے تعین کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا فکر ہمارے لئے رہنمائی کا کام سرانجام دیتا ہے۔ آپ کے فکر کا مرکزی نکتہ اللہ سے محبت کا نصب العین ہے' جو اطاعت رسول کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے۔ اللہ کی محبت کا نصب العین جب افراد اور ریاست کے جملہ اداروں کا حصہ بن جاتا ہے تو ایسی ملت وجود میں آتی ہے جو اپنی آرزوؤں اور سارے مقاصد اور ساری توانائیوں کو قدرت کے مقاصد کے ارتقاء کے لئے استعمال کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ وہ ملت دنیا میں قدرت کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس طرح ایک طرف تو وہ ملت ناقابل تسخیر بن جاتی ہے' دوسری طرف وہ غلط نصب العین کی حامل قوتوں کے لئے نجات ورہنمائی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ مسلم اُمت کے داخلی اختلافات اور انسانیت کے باہمی اختلافات کا بنیادی سبب بھی یہی ہے کہ صحیح

نصب العین کی محبت یعنی اللہ سے محبت کا نصب العین افرادِ انسانی سے کھویا گیا ہے۔ جب اطاعت رسول اور مخلصانہ عبادت کے ذریعہ اس نصب العین کی تشفی کا انتظام ہوگا تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر انسانی معاشرہ حسن و کمال کی حامل ہستی یعنی اللہ کے اوصاف و اخلاق سے مزین ہوگا' مفادات اور نفسانیت کی سیاست اور سرگرمیاں از خود مخلصانہ محبت اور رواداری میں تبدیل ہوں گی۔

مسلم اُمت جو اللہ کی طرف سے دوسری قوموں کی رہنمائی کے لئے متعین ہوئی ہے' اس وقت اس کی حالت یہ ہے کہ وہ فکری اور نظریاتی طور پر شدید انتشار سے دوچار ہے۔ اسے یہی معلوم نہیں کہ اس کا صحیح نصب العین کیا ہے۔ توحید و رسالت کے عقیدے کے باوجود عملی طور پر مسلمانوں کی زندگی نہ تو یورپی قوموں کی طرح غلط نصب العین سے ہم آہنگ ہے اور نہ ہی صحیح نصب العین ان کی ریاست اور انفرادی و اجتماعی اداروں میں بنیادی ہدف کے طور پر شامل ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اپنے فکر کے ذریعہ ہمارے لئے صحیح نصب العینی خطوط متعین کر کے مسلم ملت کو ایک طرف تو جملہ روحانی و اخلاقی خرابیوں اور ہمہ جہتی بحران سے نکال کر اس کی سیاست' معیشت' معاشرت اور ساری اجتماعی زندگی کے لئے لائحہ عمل متعین کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ اپنے فکر کے ذریعہ پاکیزہ نصب العین کی حامل ملت کو توانائی فراہم کر کے مسائل کی شکار انسانیت کے لئے اسے ماڈل کی حیثیت بھی دینا چاہتے ہیں۔

انسانی زندگی کی یہ عجب خاصیت ہے کہ اس کی ساری سرگرمیاں نصب العین کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر نصب العین متعین نہیں' یا پاکیزہ نصب العین موجود نہیں تو سرگرمیوں کا صحیح رخ متعین نہیں ہوسکتا اور زندگی شدید کشمکش اور انتشار سے دوچار ہو جاتی ہے۔ غلط نصب العین کی صورت میں انسانی نفسیات اور خودی کی صحیح سمت میں نشوونما مکمل نہ ہوگی۔ اس لئے صحیح نصب العین کا تعین' ایسا نصب العین جو انسانی فطرت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو' یہ انسانیت کے لئے موت و زیست کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے اپنی بلند فکری پرواز سے کام لیتے ہوئے ہمارے لئے

جو رہنمائی فرمائی ہے وہ عظیم رہنمائی ہے۔

فطرتِ انسانی کے میلانات سے ناآشنا دانشوروں کو فلسفہ ونظریہ پیش کرنے کا استحقاق حاصل نہیں

ڈاکٹر محمد رفیع الدین بڑی جرأت رندانہ کے ساتھ یہ نکتہ بھی بیان کرتے ہیں کہ انسانی فطرت حسن وکمال کی اصل ہستی کے ساتھ محبت کے جس نصب العین سے منسلک ہے اس ہستی کے اوصافِ حسن اپنائے بغیر اور اس کے مشاہدہ کے بغیر جو فکر وفلسفہ پیش ہوگا چونکہ وہ فطرت کے جذبات ومیلانات اور اس کے مقتضیات سے ناآشنائی پر مبنی ہو گا' اس لئے ایسے فلسفہ میں باطل کی آمیزش شامل ہوگی۔ فطرت کے حقیقی مقتضاؤں سے ناآشنا دانشوروں اور فلاسفروں کو سرے سے یہ حق ہی حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کے لئے فکر وفلسفہ پیش کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو چونکہ وہ فلسفہ فطرتِ انسانی کے میلانات ورجحانات سے عدم مطابق ہوگا' اس لئے اس طرح کا فلسفہ دنیا میں فتنہ وفساد پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس سے خیر کی توقع رکھنا ممکن نہیں۔

فروغِ اسلام کے کام کے وقت فریب نفس سے بچاؤ کی واحد صورت

یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں علم وفضل' تشریح اسلام اور دعوتِ اسلامی کے مقام پر فائز افراد کے لئے بھی یہ ناگزیر ہے کہ وہ جبلت کی حیوانی سرحدوں کو عبور کر کے اس نورِ ایمان تک پہنچیں جس کا تعلق وجدان کی گہرائیوں سے ہے۔ قرآن کے ظاہری الفاظ کے پیچ وخم میں الجھنے کی بجائے جب تک قابل ذکر حد تک تقویٰ اور یقین کے مقام تک رسائی نہیں ہوتی تب تک اسلام کا حقیقی فہم اور اس کی بصیرت کا حصول نہ صرف مشکل ہے' بلکہ ممکن نہیں' اسلامی دعوت کے جو افراد ظاہری علم کو تشریح اسلام اور دعوتِ اسلام کے کام کے لئے کافی سمجھتے ہیں وہ بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں' ایسے افراد فروغِ اسلام کے کام کے وقت نفس کے مکر وفریب میں پھنس کر معاشرہ میں تعمیر کی بجائے تخریب پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ قرآن کا یہ باطنی علم جسے نورِ ایمان'

تقویٰ اور یقین کی حالت کہا جا سکتا ہے' یہ کیسے حاصل ہوگا' اس کے لئے مخلصانہ طور پر اطاعت رسول' خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت اور کثرتِ ذکر اور پاکیزہ صحبت کا ماحول ضروری ہے۔ اس سے فہم قرآن کی رسائی کے سلسلہ میں حائل پردے اٹھ جاتے ہیں' نفس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور خدا اور بندہ کے درمیان دوئی کی دیوار گر جاتی ہے۔ نیز اندر کا مفتی بیدار ہونے لگتا ہے' جو زندگی کے ہر مرحلہ میں خدا کے لئے یا نفس کے لئے ہونے والے کاموں کی مسلسل نشاندہی کرتا رہتا ہے' بلکہ زوردار فتویٰ دینے لگتا ہے۔ حدیث میں اسی مفتی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہر معاملہ میں اندر کے مفتی سے پوچھا کرو' قرآن میں اسی نورِ ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے صحیح اور غلط کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت کے عطا ہونے کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

خودشعوری کا جلال و جمال کی صفات سے بہرہ ور ہو کر خدائی مقاصد کے فروغ اور باطل کے سدباب کے لئے کام کرنا

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے فکر کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ جب نصب العین کی محبت کو فطرت انسانی کا ناگزیر تقاضا قرار دیتے ہیں اور صحیح نصب العین اللہ کی محبت کو قرار دیتے ہیں تو اللہ کی محبت کا ایسا تصور' جس کے تحت بندہ ذکر وفکر اور مراقبوں کے ذریعہ اللہ کی ذات سے وصال میں فنا ہو کر عملی زندگی اور اس کے مقتضاؤں سے منقطع ہو جائے' وصال میں فنائیت کے اس تصور کو وہ اللہ سے محبت کے حقیقی نصب العین کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ اللہ سے وصال کی حقیقی لذت اور اس کے مشاہدہ کی حقیقی صورت تو آخرت میں ہی حاصل ہوگی' یہاں وصال اور مشاہدہ کی دھندلی تصویر اور عکس حاصل ہوتا ہے اور اس کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ فرد کی خود شعوری (شخصیت) اللہ کے نور سے منور ہو کر حیوانی اور جبلی مقتضاؤں سے قابل ذکر حد تک بلند ہو جائے اور خدائی اوصاف سے متصف ہو جائے۔ خودشعوری (شخصیت) جب ذکر وفکر' دھیان اور مراقبوں کے ذریعہ اصل خودشعوری (اللہ کی ذات) سے قربت حاصل کرتی ہے تو وہ جلال و جمال کی صفات سے بہرہ ور ہو کر ان صفات کی

قوت کے ذریعہ دنیا میں خدائی مقاصد کے فروغ اور باطل کے سدباب کے لئے مصروفِ کار ہو جاتی ہے۔ خدا کے مقاصد کے لئے اپنی روحانی قوتوں کو صرف کرنا' یہ خودشعوری کے مقاصد میں شامل ہے۔ لیکن چونکہ خودشعوری کثرتِ ذکر وفکر کے بغیر حسن وکمال کی ہستی کے جلال و جمال کی صفات سے متصف نہیں ہوسکتی' اس لئے وہ دنیا میں مؤمن کی حیثیت سے اپنے بھرپور کردار کی ادائیگی اور باطل کے خلاف صف آرائی کی توانائی سے محروم رہتی ہے' اسے یہ توانائی کثرتِ ذکر سے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کی بحث بڑی ایمان افروز اور وجد آور ہے۔

جدید نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کے سلسلہ میں ڈاکٹر موصوف کا کردار

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کے فکر کی دوسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے جدید نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر ان نظریات کے صحیح اجزاء کو باطل اجزاء سے جدا کر کے باطل اجزاء پر بھرپور علمی و استدلالی تنقید کر کے اسلام کے تصورِ لاشعور' تصورِ جبلت' تصورِ معاش' تصورِ سیاست اور تصورِ قومیت کو نہایت عمدہ طریقہ سے واضح کیا ہے۔ جدید نظریات پر ان کی یہ تنقید اور کائنات اور زندگی کے بارے میں ان نظریات کے برعکس اسلام کے تصورات پر ڈاکٹر صاحب کی یہ بحث اتنی قیمتی' جاندار' اطمینان بخش اور سیر حاصل ہے کہ جدید دور کے تعلیم یافتہ افراد سے لے کر چوٹی کے دانشور حضرات تک سب ان سے بہتر طور پر استفادہ کر سکتے ہیں اور جدیدیت کے حوالے سے یہ بحث ان کے سارے شکوک وشبہات اور اسلام پر بے اعتمادی کی فضا کو ختم کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں عالم اسلام میں اب تک ہونے والے سارے کام پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا کام بھاری ہے۔ جدید نظریات پر ان کے یہ سارے تنقیدی مباحث قرآن پر گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ قرآن چونکہ قیامت تک دنیا کے سارے مسائل میں رہنمائی کے لئے ہمارے لئے کافی ہے (حدیث قرآن ہی کی تشریح ہے) اور چونکہ قیامت تک باطل کی طرف سے پیش ہونے والے نظریات کی تردید کے لئے دلائل قرآن میں موجود ہیں' اس لئے ان دلائل کو قرآن میں تفکر کے ذریعہ اخذ کر کے باطل نظریات کے

خلاف استعمال کرنا یہ عارف فلسفی کا کام ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے یہ کام بہتر طور پر سرانجام دیا ہے۔ اگرچہ ان کے علمی دلائل کے کچھ پہلو وقتی نوعیت کے ہیں تاہم ان کی افادیت اب بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کے فکر کی تیسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے فکر میں تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور قوموں کے عروج و زوال میں تعلیم کی فیصلہ کن اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر موصوف نے کوشش کی ہے کہ مغربی فلسفۂ تعلیم (جس میں ہمارے ملک کے نظامِ تعلیم کی بنیاد شامل ہے) کی علمی بنیادوں کو متزلزل کر کے اسلام کے فلسفۂ تعلیم کی بنیادوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے' تاکہ مغربی فلاسفروں اور ماہرین تعلیم سے مرعوبیت کا خاتمہ ہو اور اسلامی فلسفۂ تعلیم کے نقوش اور خدوخال واضح ہوں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے ''تعلیم کے ابتدائی بنیادی اصول'' کے نام سے دو جلدوں پر مشتمل کتاب کے علاوہ ''اسلام کا نظریۂ تعلیم'' کے عنوان سے بھی ایک کتاب تخلیق کی ہے۔ تعلیم کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کے اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے بقول مسلم دنیا میں مغربی فلسفۂ تعلیم پر تنقید اور اسلام کے فلسفۂ تعلیم کو اجاگر کرنے کے سلسلہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا کام پہلا کام ہے جو عالم اسلام میں ہوا ہے۔

موجودہ دَور میں مسلم دنیا جس طرح کفر کے عالمی تصورات سے متاثر ہو کر اپنے عقائد و نظریات کے یقین میں کمزوری پیدا کرتی جا رہی ہے اور اپنے امتیازی ملی تشخص سے دستبردار ہو رہی ہے' اس کے اسباب و علل اور اس سنگین صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ڈاکٹر صاحب نے جو بحث کی ہے وہ ایسی بحث ہے جو موجودہ دَور کے تقریباً سارے مفکروں کی بحث سے زیادہ مؤثر' جامع اور ہمہ جہتی ہے۔

فکر و فلسفہ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی خدمات کو دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوموں اور ملتوں میں ایسی شخصیات صدیوں کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے فلسفیانہ فکر میں ملی زندگی کی تعمیر کے لئے نہ صرف پاکستان کی ملت

اسلامیہ بلکہ سارے عالم اسلام کو فکر کے اتنے اہم، قیمتی اور ہمہ جہتی نکات دیئے ہیں کہ موجودہ دَور میں ہم اگر ان نکات کی بنیاد پر اپنی ملی، ریاستی اور اجتماعی زندگی کی اپنے نظریہ کی بنیاد پر تشکیل کا کام کرتے تو ہم بجا طور پر عالمی سطح پر ساری قوموں اور ساری انسانیت کے لئے مثالی کردار کے حامل بن سکتے تھے۔ اس طرح ملت اسلامیہ بلکہ خود انسانیت آج جس بحرانِ عظیم سے دوچار ہے اس بحران سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکتی تھی۔

جدید دَور میں اسلام اور ملت اسلامیہ کو درپیش چیلنج کی نوعیت، جدید علوم کے بہاؤ وسیلاب کے مقابلہ میں قرآن اور فطرتِ انسانی کی روشنی میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید، نئے دَور کے نئے حالات میں اجتہاد کے لئے بنیادی خطوط کی نشاندہی، فلسفۂ تعلیم کے لئے بنیادی اصولوں کا تعین، جدید مغربی فلسفۂ تعلیم کی کوتاہیوں و خامیوں کی بھرپور نشاندہی، ملی زندگی کے لئے اسلامی نظامِ تعلیم کے لئے صحیح خد و خال کا تعین، نصب العینوں کی موجودہ دنیا میں اسلام کے لئے ہونے والی بہت ساری تشریحات کے اس دَور میں اسلام کی صحیح اور حقیقی نصب العینی تشریح، نظریاتِ جدید میں موجود باطل پہلوؤں کی سیر حاصل علمی تنقید، قرآنی و اسلامی فکر کی عالمگیر فکری تناظر میں پیشکش، ملت کی سیاسی، معاشی، تعلیمی، سماجی اور انتظامی و اجتماعی زندگی کی صحیح خطوط پر تشکیل جیسے بہت سارے بنیادی امور ہیں جن پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی فکر حکمت، توازن، بصیرت اور تدبر کی شاہکار ہے، جسے پڑھ کر وجدان اور عقل بے ساختہ کہنے لگتی ہے کہ موجودہ دَور میں ملت اسلامیہ کو اجتماعی حیثیت سے جس فکر کی ضرورت ہے وہ یہی فکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس فکر میں جہاں جدید استدلال اور علمی معیار کے سارے بنیادی تقاضے شامل ہیں وہاں قرآن و سنت کے سلف صالحین کے سارے بنیادی اجزاء بھی پوری طرح موجود ہیں۔

ملی زندگی کے دو مؤثر طبقات کے فکر و نظر میں افراط و تفریط کے اثرات اور اس کی نشاندہی

آج ہماری ملی زندگی کے دو طبقات کے فکر و نظر میں افراط و تفریط کی وجہ سے

اسلامی فکر کے صحیح خطوط اور نفاذِ اسلام کی صحیح ترتیب کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ پہلا طبقہ ان اہل علم و اہل دانش کا ہے جو جدیدیت سے بری طرح متاثر ہو کر یا تو سیکولرزم کا حامل ہو چکا ہے یا وہ جدیدیت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر مرعوبیت کی بنا پر اسلامی تعلیمات و احکامِ اسلامی میں پیوند لگانے یا اس کی مرعوبانہ تشریح میں اپنی توانائیاں صرف کر رہا ہے۔ اس طبقہ میں اخبارات و رسائل کے کالم نگار' کتابوں کے مصنف' کالجوں و یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور ذرائع ابلاغ پر چھائے ہوئے دانشور وغیرہ سب شامل ہیں۔ اجتہاد کے ذریعہ اسلامی قوانین کی از سرِ نو تشکیل اس طبقہ کا نعرہ ہے۔ چونکہ یہ طبقہ غیر اسلامی تعلیمی و تربیتی مراحل سے گزرا ہے اور جدید فکر کے زیر اثر ہی اس کی دینی اور مزاجی نشو ونما ہوئی ہے اس لئے یہ اسلام کی پابندیوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس طبقہ میں بعض ایسے دانشور بھی شامل ہیں جو فرائض کی حد تک اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں لیکن مستشرقین کی تحقیقی کتابوں کے زیر اثر علمائے ربانی کی تشریحِ اسلام اور اجتہادِ اسلامی پر ان کا اعتماد مجروح ہو چکا ہے۔

دوسرا طبقہ مذہبی لیڈر شپ کا ہے' جو دینی معاملات میں لوگوں کی رہنمائی اور نفاذِ اسلام کی تحریک کا علمبردار ہے۔ ہمارا یہ طبقہ اسلام سے اپنے اخلاص کے باوجود نئے دور کے نظریاتی چیلنج اور عمرانی مسائل سے عدم واقفیت اور نفاذِ اسلام کی تدریجی حکمت عملی سے ناآشنائی کی وجہ سے اسلام کی اس طرح نمائندگی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے جس میں تدبر' پختگی' حقیقی شانِ اجتہاد اور سنجیدگی سے زیادہ جذباتیت اور سادگی موجود ہے۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے علمی کام سے عدم دلچسپی' معاشرہ کی سطح پر اسلامی فکر کو ہضم کرانے اور افرادِ معاشرہ کے نقطۂ نگاہ کو اسلامی بنائے بغیر سیاسی سطح پر نفاذِ اسلام کے کام کو دین کا کلی کام سمجھنے کی وجہ سے ہماری یہ دینی لیڈر شپ جدید چیلنج سے عہدہ برآ ہونے جیسے عظیم کام کی گہرائی و گیرائی سے پوری طرح بہرہ ور نہیں۔

ان دونوں طبقات کے فکر و نظر کی کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کے لئے توازنِ فکری کے ساتھ راہِ عمل اور حکمت عملی کے خطوط کے تعین کے سلسلہ میں بھی ڈاکٹر محمد رفیع

الدین صاحب کے پیش کردہ نکات بڑے حکیمانہ ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں ''پاکستان کا مستقبل'' کے نام سے کتاب لکھ کر پاکستان کی تعمیر و تشکیل نو کے لئے تفصیل سے ایک نظریاتی خاکہ تیار کیا' جس میں آپ نے بتایا کہ قدرت نے ہمیں عالمِ اسلام اور ساری دنیا کی رہنمائی کرنے کا عظیم موقع فراہم کیا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اگر ہم نے اپنے نظامِ تعلیم' نظامِ سیاست اور نظامِ اخلاق کی بنیاد اسلامی تعلیمات اور اس کے اصولوں پر استوار نہ کی تو ہم گرا دیئے جائیں گے اور ہم ایسے انتشار اور خلفشار سے دوچار ہو جائیں گے کہ ہماری اجتماعیت بکھر جائے گی اور غلامی و زوال سے بچنا ممکن نہ ہوگا۔

جدید نظامِ تعلیم کا بے خدا فلسفہ
اور اجتماعی زندگی پر اس کے تباہ کن نتائج

ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۵۵ء میں ''اسلام کا نظریۂ تعلیم'' کے نام سے کتاب لکھ کر اس میں جدید مغربی نظامِ تعلیم (جو ہمارے ملک میں بھی مروج ہے) کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ طالب علم کو کسی عقیدہ کی تعلیم نہیں دینی چاہئے' تاکہ اس کی عقل آزاد رہے اور اس میں خود ہر بات پر غور و فکر کر کے اسے ردّ یا قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو' اگر استاد کی طرف سے کوئی عقیدہ ٹھونسا گیا تو پھر اس کی سوچ بچار تنگ دائرہ کے اندر مقید ہو جائے گی۔ لیکن اس اصول پر عمل کرنے کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ طالب علم کی عقل تو آزاد ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس کے خیالات کا کوئی مرکز نہیں بنتا اس لئے وہ فکری انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ طالب علم کے اندر اس عقیدہ کو پیدا کیا جائے اور پختہ کیا جائے جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔

چونکہ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد بے خدا فلسفہ پر ہے' اس لئے اس زمانہ میں انسانی

فطرت اور انسانی افعال و اعمال کے بارے میں جتنے بھی نظریات وجود میں آئے ہیں وہ سب کے سب بے خدا ہیں۔ مثلاً بے خدا فلسفۂ سیاست' بے خدا فلسفۂ اخلاق' بے خدا اقتصادیات' بے خدا قانون' بے خدا فلسفۂ تاریخ' بے خدا نفسیاتِ فرد اور بے خدا نفسیاتِ جماعت' یہ سارے نظریات اسی نظامِ تعلیم کا شاخسانہ ہیں۔ اگر ہم نے قدرت کی دی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنے نظامِ تعلیم کو بلا تاخیر عقیدۂ توحید اور تعلیماتِ اسلامی کی بنیاد پر استوار نہ کیا تو دنیا کی قوموں میں ہمارے لئے عزت و وقار کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے گی' محتاجی اور ذلت ہم پر مسلط کر دی جائے گی۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کے فکر کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ انسانی فطرت اور شخصیت کی تخلیق کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ انسان اشیاءِ کائنات اور مظاہر کائنات کے پس پردہ کارفرما بنیادی قوانین اور ان میں جاری جزوی قانون اور اس کے اسباب وعلل کو جاننا چاہتا ہے اور اس کے لئے وہ مضطرب ہے۔ چونکہ انسان کے ذہنی قویٰ میں یہ استعداد موجود ہے کہ وہ تلاش و تحقیق کی بتدریج ارتقائی کاوش سے اشیاءِ کائنات میں پوشیدہ قدرت کے ان قوانین کی اصلیت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے' اس لئے نبوت کے ذریعہ کائنات کے نظام میں پوشیدہ ان قوانین سے انسان کو آشنا نہیں کیا گیا۔ جس چیز کی صلاحیت و استعداد انسان کے ذہنی قویٰ میں موجود ہو' نبوت و وحی کے ذریعہ ان قوانین سے واقفیت چونکہ انسانی قویٰ کی استعداد کے اضمحلال کا موجب تھا' اس لئے یہ کام انسان کی ذہنی کاوشوں کے لئے چھوڑا گیا۔ خود قرآن میں اس کام کی غیر معمولی اہمیت پر زور دیا گیا۔ قرآن حکیم نے آسمانوں اور زمینوں میں مظاہر قدرت کو دیکھنے کے بعد ان پر غور و فکر کے بغیر آگے گزر جانے سے منع کیا ہے کہ ایسا کرنے سے خدا کی معرفت کے مواقع ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ طبیعیاتی علوم' حیاتیاتی علوم' نفسیاتی علوم اور اس کی ساری شاخیں سائنسی علوم کہلاتے ہیں۔ یہ سارے علوم علمی صداقت کی حیثیت رکھتے ہیں اور آیات اللہ کے ایک سلسلہ کے طور پر وجود میں آتے ہیں' اس لئے یہ سائنسی علوم دراصل قرآنی تشریح و تعبیر کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ جدید سائنس کے بے خدا ہونے کا

سبب یہ ہے کہ جدید سائنس دانوں کی طرف سے مظاہر قدرت کا مشاہدہ و مطالعہ منکر خدا کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کا وجدان غلط معبود کی محبت سے سرشار ہوتا ہے' اس لئے انہیں مظاہر قدرت' آیات اللہ یعنی خدا کی ہستی' اس کی صفاتِ خالقیت اور ربوبیت پر دلالت کرنے والے نشانات کی حیثیت سے نظر نہیں آتے۔

جدید سائنسی علوم کا کائنات کی اصل اور بنیادی حقیقت اور قرآنی حقائق کے خلاف استعمال ہونے کا بنیادی سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ سائنس دان یا سائنس کو فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرنے والے فلاسفر پہلے سے باطل نصب العین کی محبت سے سرشار ہوتے ہیں' اس لئے مظاہر قدرت حقیقت تک رسائی میں ان کے ممد ومعاون ثابت نہیں ہوتے۔ سائنس نے حیاتیات' طبیعیات اور نفسیات میں جن علوم کا انکشاف کیا ہے ان علوم میں صداقت کے بہت سے اجزاء ایسے موجود ہیں جو کائنات میں پوشیدہ قوانین قدرت سے آشنائی اور خدا کی صفاتِ خالقیت و ربوبیت کے جلوہ کے مشاہدہ کا ذریعہ ہیں۔ سائنس کی علمی صداقتیں دراصل قرآنی حقائق کی تفصیلات و جزئیات ہیں' جو سائنس کے باطل فلسفہ کا حصّہ ہو کر باطل فلسفہ کی زینت' رونق اور ترقی کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ باطل فلسفہ میں موجود اِن صداقتوں کو جو قرآنی حقائق کا حصّہ ہیں' جو قرآن سے جدا کی گئی ہیں' ان کو پھر سے قرآن سے جوڑ دیا جائے۔ سائنس کی علمی صداقتیں نورِ قرآن کی بکھری ہوئی کرنیں ہیں جو ظلمت کفر میں کھوئی ہوئی ہیں۔ ان کرنوں کے ذریعہ سے جہاں تعلیم نبوت کو دنیا کے کناروں تک پہنچایا جا سکے گا وہاں اس آلۂ حرب وضرب کو دشمن کے خلاف استعمال بھی کیا جا سکے گا اور ردِ باطل کے لئے یہ صداقتیں غیر معمولی طور پر مؤثر ثابت ہوں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان علمی صداقتوں کا تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ان کے ذریعہ قرآن کے مطالب کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تشریحِ قرآن اور تعبیرِ اسلام کے بارے میں اُمت میں موجود سارے اختلافات مضمحل ہو جائیں گے اور مسلم ملت کی ساری عملی زندگی قرآن کی بنیادوں پر استوار ہو سکے گی۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے سائنس میں موجود علمی صداقتوں کی قرآن کی تشریح کی حیثیت سے جس نکتہ پر توجہ دلائی ہے وہ نہایت اہم نکتہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''اسلام اور سائنس'' کے نام سے اپنی کتاب اور قرآن اور علم جدید میں اس موضوع کے بیشتر پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ہمارے علماء وفضلاء اگر اپنی ذہنی کاوشوں کے لئے قرآن کی اس تشریح کو موضوع بحث بنائیں تو ہمیں جدید دَور کے چیلنج سے زیادہ بہتر طور پر عہدہ برآ ہونے اور اسلام کو دنیا کی ساری قوموں کے لئے قابل قبول دین کی حیثیت دلانے میں مدد ملے گی۔ قرآن میں اس آنے والے دَور کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ﴾

''ہم عنقریب انہیں انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے (یعنی ایسے علمی حقائق ان پر منکشف کریں گے) جن سے ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن برحق ہے''۔

الغرض کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے دانا' بینا اور عارف فلسفی کی حیثیت سے اسلامی فکر کی نصب العینی تشریح وتعیین' اسلامی تحقیق کے صحیح طریق کار کی نشاندہی' اسلامیات کے مغربی محققوں کے طریق کار کی کمزوریوں کی نقاب کشائی' نفاذِ اسلامی کی صحیح تربیت سے لے کر نظامِ تعلیم کی نظریاتی بنیادوں پر تشکیل سے انحراف کے نتائج کے انتباہ تک مسائل اور فکر ونظر کے بہت سارے گوشوں کے بارے میں فکر انگیز رہنمائی کی ہے۔

ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی کتابوں سے اقتباسات پیش کریں' تاکہ ملی اور قومی زندگی کے اہم معاملات میں غور وفکر کی بہتر صورت پیدا ہو سکے اور اگر قوم کے اہل دانش اور قومی لیڈر شپ میں استفادہ کی صلاحیت موجود ہو تو وہ اس سے استفادہ کر سکے۔ اگرچہ ان اقتباسات سے یہ مضمون کافی طویل ہو جائے گا' تاہم اس کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ ملت کے بنیادی نظریاتی مسائل کے بارے میں عالم اسلام کے ممتاز فلسفی کی تحریروں کا عطر سامنے آ سکے۔

آدرش کی محبت کے جذبہ کی نوعیت

آئیڈیل یا آدرش کی محبت کا جذبہ انسان کے سارے اعمال کا سرچشمہ ہے' یہ جذبہ ایسا ہے کہ اگر انسان اس کے اظہار کا صحیح طریق نہ جانتا ہو تو اس کا اظہار غلط طریق سے کرتا ہے' یعنی ایک غلط تصور کو اپنا آدرش بنا لیتا ہے' پھر خدا کی تمام صفات اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کی عبادت اور اطاعت اس طرح کرتا ہے گویا وہ سچ مچ خدا ہے یا خدا کی صفات کا مالک ہے' لیکن صحیح' کامل اور سچا نصب العین اس ہستی کا تصور ہے جو اِس کائنات کی خالق ہے' جو ربّ ہے' رحمٰن و رحیم ہے' حی و قیوم ہے' علیم و قدیر ہے اور فرضی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر تمام صفاتِ حسن و کمال کی مالک ہے۔ (قرآن اور علم جدید' ص ۲۵۱)

(جاری ہے)

بقیہ: سورۃ الحدید

میں ہے۔ عالم اسم فاعل ہے' علیم اسی سے صفت مشبہ ہے۔ اسم فاعل میں کوئی فعل وقتی طور پر ہوتا ہے اور اگر وہی فعل کسی کے اندر دائم ہو جائے تو پھر وہ صفت مشبہ بن جاتا ہے۔ عالم: کسی شے کا جاننے والا اور علیم: جس میں یہ صفت مستقل اور پائیدار ہو گئی ہے۔ اسی طرح حاکم وہ ہے جس کی حکومت قائم ہے' اور حکیم جس کی حکومت میں دوام ہے' استقلال ہے' ہمیشگی ہے' پائیداری ہے۔ تو اس اعتبار سے یہ دونوں الفاظ مترادف ہو جائیں گے اور ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' کا مفہوم ہوگا کہ وہ زبردست ہے اور وہ حاکم حقیقی ہے۔ (جاری ہے)

[نوٹ: سورۃ الحدید کا یہ درس محترم ڈاکٹر صاحب نے قرآن آڈیٹوریم میں ہفتہ وار نشستوں میں دیا۔]